جنوبی پنجاب میں تدوین متن ادبیات کی مشکلات

ڈاکٹر روبینہ رفیق / ڈاکٹر راشدہ قاضی

Abstract:

Though this article seems to relate to a specific cultural zone but it highlights the importance of editing stray pages of cultural and literary heritage before submitting it for evaluation to social thinkers ,linguists and critics. It also discusses the methodology of Orientists and their legacy in the wake of new trend of post colonial criticicism. For the students of Urdu "translation and editing school of Hyderabad Decan under the leadership of Moulvi Abdul Haq, Farhatullah Baig,M.H.Qadri Zour set an example for present day researchers of lanuages and literature of less privilleged areas. However in some cases our instittions face the scarecity of scholars of Urdu with an insight of cultural history and command over Arabic and Persian languages. In some cases they also lack a training to identify real or credible manuscipt and a library with a sock of the riches of past but in present day technolgy to enable carbon test of page and ink and access to numerious digital data of libraries in all over the world and giving opportunity to group research .

پنجاب میں قیامِ پاکستان سے بھی ایک صدی پہلے لاہور فارسی کے بعد اُردو زبان کی اشاعت کا ایک بہت بڑا مرکز بن چکا تھا جسے گورنمنٹ کالج لاہور، پنجاب یونیورسٹی لاہور اور انجمنِ حمایتِ اسلام کے قائم کردہ تعلیمی اداروں، کتاب خانوں، اشاعت گھروں، اصحابِ علم اور اصحابِ ثروت کی توجہ روزبروز پورے برصغیر میں ایک بہت بڑے مرکزِ علم وادب کا درجہ دے رہی تھی۔ آج یہ بحث ضرور ہوتی ہے کہ ملتان تاریخی اعتبار سے لاہور سے زیادہ قدیم ہے یا ریاست بہاولپور کی علم دوستی نے اشاعتِ وفروغِ علم پر بڑی توجہ دی، مگر یہ حقیقت چھپائے نہیں چھپ نہیں سکتی کہ بعد کے زمانوں میں غیر علمی عوامل (پنجابی اور ملتانی اور پھر پنجابی اور سرائیکی آویزش، قیامِ پاکستان کے فوراً بعد مہاجرین کی طرف سے دھرتی پر توجہ دینے والے عناصر سے خوفزدگی، قوم پرستانہ جذبات میں مبالغہ آمیزی کچھ عالموں اور درس گاہوں کے مابین آویزش) نے جنوبی پنجاب میں تدوینِ متن میں صرف خانقاہی متون کو اہمیت دی اور اس بات پر زیادہ توجہ صرف نہ کی کہ حیدر آباد دکن کی طرح یہاں کی مسلم ریاستیں بھی شاہی خانوادوں کے سوا عام لوگوں کی بیاضوں کو تلاش کرتی عالموں سے انہیں پڑھوانے کا اہتمام کرتی اور اس کی اشاعت کا ایسا بندوبست کرتی کہ ان خطوں کو سچ مُچ حقیقی علمی شناخت میسر آتی۔

بد قسمتی سے گدی نشینوں کی زیادہ توجہ اپنے شجروں کی حفاظت یا ایسی اصلاح پر رہی جو بزرگانِ دین سے وقف املاک پر انہیں متصرف رکھ سکے یا پھر کوشش کی گئی کہ صرف ان بزرگوں سے منسوب کرامات یا اورادووظائف کی اشاعت پر توجہ دی جائے۔ ادبیات کو شاید گمراہی

کا ایک وسیلہ گمان کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت بڑا علمی وادبی سرمایہ جس میں لغت، تقابلی لغت یا فکری مصادر کا بہت بڑا حصہ تھا وہ چند نجی خانوادوں کے تصرف میں ہی رہا۔ اگر کبھی ان ذخائر کا دروازہ کچھ پڑھے لکھوں پر کھولا گیا تو یہ احتیاط برتی گئی کہ وہ روحانی طور پر یا مالی طور پر ان گدی نشینوں کے ہاتھ پر پہلے بیعت کریں تاکہ اُن کا قلم کسی قسم کی گستاخی کا مرتکب نہ ہو۔ میں اس سلسلے میں مخطوطاتِ اُوچ شریف کی مثال پیش کروں گی جہاں اگر علیگڑھ یونیورسٹی کے تاریخ کے ایک پروفیسر تشریف نہ لاتے اور مخدوم صاحبان کو یہ نہ بتاتے کہ وہ کسی اعزازیہ کے بغیر یہ فہرست اُن کو بنا کر دینے کیلئے تیار ہیں اور شاید اسے علیگڑھ سے شائع کرنے کیلئے بھی تو غالباً وہ اُن سے تعاون نہ کرتے۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان خطوں کی یونیورسٹیاں اُن کے تاریخ، علوم شرقیہ اور زبانوں کے شعبوں کے اساتذہ اور طالب علم اس سرمائے سے بے تعلق ہوجائیں۔

بے شک آج آزادی کے بعد ہمیں حق حاصل ہے کہ ہم مغرب کے مستشرقین کے اغراضِ غیر علمی کے شواہد تلاش کریں مگر اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ہمارے ہاں ایک بہت بڑا کام انگریز کے دورِ اقتدار میں ہوا۔ آپ Linguistics Survey of India کو لے لیجئے جو آج بھی برصغیر میں لسانیات کے حوالے سے پہلا اہم ماخذ ہے۔ اسی طرح سے اُردو کی ابتدائی فرہنگوں یا گرائمر ہی نہیں پنجابی، ملتانی اور سندھی کی حکایات اور کہانیاں بھی اسی دور میں مرتب ہوئیں، حتیٰ کہ ملتان میں دیوان مُول راج کے زمانے میں دو انگریزوں کے قتل پر سوبھہ شجاع آبادی نے جو ملتانی زبان میں نظم لکھی اُسے بھی انگریزوں نے گزیٹئر آف ملتان میں رومن رسم الخط میں شائع کردیا۔ اسی طرح بائبل سوسائٹی نے ملتانی اور پنجابی میں انیسویں صدی میں ہی بائبل شائع کی جس پر امرتسر کے پریس کا حوالہ موجود ہے، مگر آزادی کے اتنے برسوں کے بعد بھی ہم ان مترجمین کے بارے میں کوئی خاطر خواہ معلومات پیش نہ کرسکے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا ہے۔ ہماری دانش گاہوں میں شعبوں اور سکالرز کی تعداد بڑھتی جارہی ہے اور اُن کے مقالات کی بھی مگر وہ علمی انہماک اور ژرف نگاہی کمیاب ہوتی جارہی ہے جو مختلف مخطوطوں کے امتیازات پر توجہ دے سکے، حواشی قائم کرسکے بلکہ سرے سے انہیں پڑھ بھی سکے کیونکہ ملتانی اور پنجابی کا بہت سا سرمایہ اُن مخطوطوں میں موجود ہے جو فارسی میں لکھے گئے۔ اُن میں نمونے کی زبان کے طور پر مقامی زبانوں کی مثالیں پیش کی گئیں یا تقابل کے طور پر کچھ زبانوں کے نمونے جمع کردئیے گئے۔ اسی طرح قوم پرستانہ جوش میں بعض ابتدائی محقق ایسے دعوے کردیتے ہیں جس کی سند مانگنا قومی جذبے کے منافی خیال کیا جاتا ہے، جیسے بلوچستان کے لوگ مہر گڑھ کی بات کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اُس خطے کی دو سے تین سو سال پرانی تاریخ کی ابھی ابواب بندی ہورہی ہے۔ 7ہزار سال کا دعویٰ کرنا اور آج سے ہزاروں برس پہلے کا قیاس کرنا رومانوی عمل تو ہے مگر علم اس کی توثیق نہیں کرسکتا۔ یہی عالم ملتان کی قدامت سے متعلق دعوؤں کا ہے اور تو اور سرائیکی کے ایک نامور محقق نے مُلا وجہی کی سب رَس میں سرائیکی کی مستعمل آوازوں کی مثالیں دی ہیں مگر ایک طرف اگر سترہویں صدی کی اس دکنی تصنیف کا حوالہ ہے تو دوسری طرف اُس سرائیکی زبان کو پیش کیا گیا ہے جو بیسویں صدی کی ہے گویا تقابل کرکے قدامت کا جائزہ لینے کیلئے ضروری ہے کہ دونوں زبانوں کے ماخذات ہمارے رُوبرو ہوں۔

سرائیکی کے معروف شاعر شبیر حسن اختر نے ملتان کی7ہزار پرانی تاریخ کو اپنے Epic یا رزمیہ کا موضوع بنایا 'ملوھیا: سدا سہاگن' (سرائیکی ریسرچ سنٹر زکریا یونیورسٹی ملتان،۲۰۰۴) جس میں ویدک عہد کی ایک رقاصہ پدما وتی کے ایک مصور ساگر سے عشق کا قصہ بھی ہے اور تاریخِ ملتان کے مختلف ابواب کا قوم پرستانہ اور ترقی پسندانہ جائزہ لیا گیا، مگر شاہ نامۂ فردوسی تو دور کی بات ہے شبیر حسن اختر کے مقام اور مرتبے کے باوجود یہ حفیظ جالندھری کی منظوم تاریخ شاہ نامۂ اسلام کا پاسنگ بھی نہیں۔

یہ درست ہے کہ ملتان لاہور کے مقابلے میں زیادہ قدیم خطہ ہے اور ملتانی زبان کے شواہد زیادہ قدیم ہیں، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ملتانی زبان کو سرائیکی کا سیاسی نام دینے کے سبب کچھ

مغالطے پھیلے اور یہ زبان کئی سو سال کی علمی روایت سے کسی قدر محروم ہوگئی۔ دوسرے ریاست بہاولپور کے قیام کے بعد اس ریاست نے کوشش کی کہ اپنے علماء کی مدد سے گردونواح سے علمی مصادر کو متعین کیا جائے اور اُن کی اشاعت کا اہتمام بھی ہو، اسی طرح ملتان میں بھی بڑی درس گاہوں یا مدارس یا علم دوست اداروں کے طفیل تدوینِ متن کا کچھ کام ہوا مگر ڈیرہ غازیخان میں یہ کام سرے سے نہ ہوسکا کیونکہ یہاں کے سردار نہ علمی اعتبار سے کوئی فضیلت رکھتے تھے اور نہ وہ عوام کے دلوں پر راج کرنے والے سخی سرور یا نظام تونسوی یا دیگر صوفیاء سے کوئی ایسی اِرادت رکھتے تھے کہ وہ وہاں موجود مخطوطوں پر توجہ دیتے۔ اسی طرح داجل، جام پور یا راجن پور کی قدامت پر باتیں کرنے والوں نے زیادہ تر سنگریزے اور ٹھیکریاں جمع کیں، علمی نوادر کی دریافت پر متوجہ نہ ہوسکے۔ تقسیم ہند بھی ایک بہت بڑا عامل ہے جو اس تحقیق کے راستے میں رکاوٹ بن گیا۔ بڑے پیمانے پر اہلِ علم کی ہجرت یا ہنگامے میں علمی ذخائر کی آتش زنی اور بربادی نے بہت سے شواہد کو نقصان پہنچایا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس خطے کی معاشی پسماندگی ان شواہد کی دریافت میں بہت بڑی رکاوٹ بنی۔ وگرنہ انقلابِ ایران کے بعد نئی حکومت نے جنوبی پنجاب سے تاریخی اور علمی آثار جمع کرنے شروع کئے تو اُن کی خریدنے کی بہتر صلاحیت یا اس خطے میں معتوب شیعہ اقلیت کی جذباتی کیفیت کی بنیاد پر خانہِ فرہنگِ ایران کا دامن ان نوادرات سے بھرگیا۔ اس کے مقابلے میں ہماری بڑی درس گاہیں انہیں خریدنے سے قاصر رہیں۔

تاہم یہ غنیمت ہے کہ بزم ثقافت ملتان کے عمر کمال خان، سردار عبدالجبار،ریاض انور،عاشق محمد خان درانی اور ارشد ملتانی سرائیکی مجلس کے امید ملتانی،اسلم انصاری،سرائیکی ادبی بورڈ کے ڈاکٹر مہر عبدالحق،حبیب فائق،ڈاکٹر طاہر تونسوی،شوکت مغل، جھوک کے خان رضوانی اور ظہور دھریجہ ، شبیر حسن اختر،سرائیکی مصنفین کی انجمن کے ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز،پھر زکریا یونیورسٹی کے ریسرچ سنٹر کے ڈائرکٹر ڈاکٹر انوار احمد،اور پھر ریاست بہاولپور کی سرپرستی میں اہم کام اور پھر کالج آف آرٹس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر نصراللہ ناصر اور پھر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے شعبہ سرائیکی اور اسلم رسول پوری اور حفیظ خان جیسے لوگوں نے سرائیکی متون کے حوالے سے ابتدائی کام کرنا شروع کیا۔مستشرقین کے لغت اور قواعد اور ترجمے اور تدوین کے کام کا تعارف کرایا گیاہم یہاں شوکت مغل کی ایک کتاب ’مقدمات‘ میں سے دو طویل اقتباسات پیش کرتی ہیں:

الف:’’انگریزوں نے 1849ء میں سلطنت ملتان پر قبضہ کیا تو اس علاقہ میں ان کی دلچسپی پیدا ہوئی۔1857ء میں سندھ اور ہند پر مکمل قبضہ کرلینے کے بعد ان کی ہوسِ ملک گیری کی اگرچہ تکمیل ہوگئی لیکن اقتدار کو مضبوط تر کرنے ، عوام کے دلوں کے اندر جھانکنے اور لوگوں کو عیسائیت کی طرف مائل کرنے جیسی اغراض اُن کے دامن گیر ہوگئیں۔ ان کے دلوں میں مختلف زبانوں ، ثقافتوں اور تہذیبوں کو زیر کرنے کی خواہش بھی بیدار ہوگئی۔ ان مقاصد کی تکمیل کے مستشرقین نے کام شروع کیا۔ انہی مستشرقین میں ایڈورڈ اوبرائن بھی تھے جو مظفرگڑھ میں سیٹلمنٹ افسر تھے جنہوں نے سیٹلمنٹ کمشنر لاہور کے حکم پر مقامی زرعی اصطلاحات کا ذخیرہ الفاظ یکجا کرنے کا کام 1873ء میں شروع کیا۔ ان کا یہ کام 1880ء میں مکمل ہوا اور غالباً 1882ء میں شائع ہوا جسے Report on the Land Revenue Settlement Muzaffargarh, Dist of Punjab.کہا جاتا ہے۔ اس دوران میں 1881ء میں اوبرائن نے سرائیکی زبان سے متعلق جمع شداد مواد بھی شائع کردیا جس کا نام Glossary of the Multan Language رکھا گیا۔ اس کتاب میں انہوں نے مختلف موضوعات بالخصوص زرعی زندگی پر مشتمل اصطلاحی الفاظ، کہاوتوں اور اشعار کے علاوہ تقریباً 5ہزار الفاظ کا لغت بھی شامل کیا۔ جلد ہی یہ کتاب اپنی مانگ کے سبب مارکیٹ سے غائب ہوگئی۔ اس دوران میں شاہ پور کی سیٹلمنٹ کمشنر مسٹر جیمز وِلسن نے پنڈت ہری کشن کول کی معاونت سے گلاسری کو ازسرِ نو ترتیب دیا اور اس میں ملتانی زبان کی گرامر کا اضافہ کرکے اسے نئی ترتیب کے ساتھ 1903ء میں شائع کردیا۔ اس وقت سے آج تک

گلاسری کی وہی ترتیب چلی آرہی ہے۔ اس گلاسری کو پٹیالہ (ہندوستان) سے ایک بار پھر چھاپا گیا جس کا تیسرا ایڈیشن 1962ء میں سامنے آیا لیکن وہ ایڈیشن بھی اب مارکیٹ میں دستیاب نہیں ہے۔

اوبرائن کی گلاسری (فرہنگ) چار حصوں پر مشتمل ہے۔
1۔گرامر(یہ حصہ جے ۔ولسن نے شامل کیا)۔
2۔مفید الفاظ(مختلف موضوعات کے بارے میں عوام کی زبان پر موجود اصطلاحی الفاظ)
3۔ضرب الامثال ، کہاوتیں، اشعار(سنی سنائی کہاوتیں اور اشعار بالخصوص زرعی زندگی کے بارے میں)
4۔ڈکشنری (تقریباً 5ہزار الفاظ رومن رسم الخط میں اور معانی انگریزی زبان میں)'' (۱)
ب:''اپنے مذہبی مشن کی تکمیل کیلئے مستشرقین میں سب سے پہلے مسٹر ایڈورڈ برائن نے1881ء میں اپنا مختصر لغت ''گلاسری آف دی ملتانی لینگویج'' نامی کتاب کا حصہ بنا کر پیش کیا ۔ان مستشرقین میں دوسرا اہم نام ڈاکٹر اینڈ ریوجیو کس کا ہے جو پیشہ کے لحاظ سے ایک ڈاکٹر تھا اور اس کا تقرر1878ء میں بطور میڈیکل مشنری ایک ایسی چرچ مشنری سوسائٹی میں ہوا تھاجو اس وقت پنجاب اور سندھ میں کام کررہی تھی۔ یہاں سے اسے ڈیرہ غازیخان کے بلوچ مشن میں متعین کردیا گیا۔ وہ یہاں1906ء تک کام کرتا رہا۔ اُس نے اس علاقے میں رہ کر ایک سرائیکی لغت مرتب کیا جس کے سرائیکی الفاظ سرائیکی رسم الخط اور رومن رسم الخط میں تھے اور ان کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا گیا ۔ جیوکس کا اصل کام چاروں اناجیل کو سرائیکی زبان میں ترجمہ تھا جس کے لئے لغت کا ہونا ضروری تھا (اُس کی محنت سے انا جیل کا ترجمہ 1898ء میں مکمل ہوکر شائع ہوا)۔ڈیرہ غازیخان کے قیام کے دوران میں جیوکس کو محمد حسن نامی ایک شخص مل گیا جسے جیوکس نے بطور منشی (معاوضہ پر) اپنے ساتھ رکھ لیا۔ جیوکس نے سرائیکی زبان کی مخصوص آوازوں کو ظاہر کرنے کیلئے محمد حسن کی معاونت سے کچھ علامتیں بھی وضع کیں اور بالآخر جیوکس ایک لغت مرتب کرنے میں کامیاب ہوگیا جسے اس نے Dictionary of the JATKI of WESTERN PUNJABIکا نام دیا۔ یہ لغت دو حصوں پر مشتمل تھا ۔ پہلا حصہ سرائیکی انگریزی پر مشتمل تھا اور دوسرا انگریزی سرائیکی پر (جیوکس سرائیکی کو مغربی پنجابی کہتا ہے) ۔ جیوکس کے مرتب کردہ لغت کا پہلا حصہ 1900ء میں ریلیجئس بک اینڈ ٹریکٹ سوسائٹی لاہور سے شائع ہوا جس کا ایک دفتر لندن میں بھی تھا مگر دوسرا حصہ تادمِ تحریر شائع نہیں ہوسکا(معلوم نہیں اس کا مسودہ کہیں موجود بھی ہے یا نہیں)انڈریو جیوکس پیشہ کے لحاظ سے اگرچہ ایک ڈاکٹر تھا لیکن سرائیکی زبان کا یہ لغت مرتب کرکے اس نے خود کو ایک ماہر لسانیات کے طور پر پیش کیا ہے۔ آج سے تقریباً سوا صدی قبل ایک ایسی زبان پر کام کرنا انتہائی دل گردے کی بات تھی جس کے لہجے سے بے شمار، جس کے بولنے والوں کا علاقہ بے حد وسیع ، جس کا تحریری ادب غیر معمولی حد تک کم، جس کی تدریسی وعلمی اہمیت نہ ہونے کے برابر اور جس کا ذخیرۂ الفاظ محض بولنے کی حد تک موجود تھا۔تاہم جیوکس کی بائیس سالہ محنت اور اس کا خلوص اس کے کام آیا اور وہ ایک ایسا کام کرگیا جو ایک صدی گزرنے کے بعد بھی برصغیر کی لسانی تاریخ میں روشن مینار کی طرح نمایاں ہے''۔(۲)
بہت سے خطوں کے لوک رہس اور قصوں میں علم البشر اور اساطیر شناسی بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں،پاکستان میں بھی لوک ورثہ نے بنیادی ماخذات کو زبانی کی بجائے تحریری دستاویزات بنانے کے لئے اہم کام کیا،یہی وجہ ہے کہ عمر کمال خان، ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز،شوکت مغل؛ ،نصراللہ ناصر،مظہر عارف ،عمر علی بلوچ اور دیگر ناقدوں اور محققوں نے اس سلسلے تواتر سے لکھا کہ سرائیکی زبان میں واریں یا پوڑیوں کی تاریخ دیکھنی ہو تو پہلے سرائیکی کے رزمیہ ادب پر نگاہ ڈالنی ہوگی۔اس سلسلے میں ارشد ملتانی کے مضمون''سرائیکی دا رزمیہ ادب '(مطبوعہ :سرائیکی، جنوری ۱۹۷۲ء)سے لے کر میر حسان الحیدری کے مقالے ''سرائیکی ادب ''کا یہ فقرہ ہماری رہنمائی کرسکتا ہے کہ

''سرائیکی میں مذکورہ بالا دتوں کے کتبوں کے علاوہ ایک ترجمہ
قرآن اور بہت سی طویل رزمیہ نظموں کا بھی سراغ ملتا ہے ''۔(۳)

''ماہ نو ''کراچی کے شمارہ جون ۱۹۵۲ء میں اختر ولید نے اپنے مضمونوں ''ملتانی زبان کی تاریخ ''میں دَت قوم (جو حسینی بھی کہلاتے ہیں) کا ایک قدیم ملتانی کبت درج کیا ہے۔ اسے سرائیکی کے قدیم رزمیہ ادب کے ساتھ ساتھ وار کی ابتدائی شکل قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں مظہر عارف کا یہ بیان کافی دلچسپ ہے:

''لوک ادب اور لوک تاریخ روایتی طور پر شعروں میں لکھی گئی ہے ۔ لوک شاعری زیادہ تر جذبوں کی ترجمان ہے جبکہ واریں سماجی اور سیاسی حالات کا آئینہ ہیں۔ جہاں بھی قو می حقوق کی تحریکیں چلی ہیں وہاں کے قوم پرستوں نے تاریخی ورثے کی تلاش کی ہے ۔ تعمیرِ تاریخ کے اس کام میں واریں اہم ترین ذریعے بنتی ہی۔ آج سرائیکی واریں اکٹھا کرنا درحقیقت سرائیکی تاریخ لکھنا ہے ''(۴)

سرائیکی خطے کا قدیم ترین علمی اور تہذیبی مرکز ملتان ہے،اس لئے ملتان میں ہی سب سے زیادہ واریں تاریخ اور تاریخی شخصیات کے حوالے سے سامنے آئی ہیں ۔ ایسی واریں مندرجہ ذیل کتابوں میں موجود ہیں۔

نواب مظفر خان شہید اور اس کا عہد، عمر کمال خان، فاروقیہ کتب خانہ ملتان، ۱۹۷۸ء
لہندی شعرریت ، پروفیسر شاہین ملک، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ لاہور ۱۹۸۷ء
ملتانی واراں، عمر کمال خان، بزم ثقافت ملتان ، اپریل ۱۹۹۱ء
کلیات شاہ عظیم ، سعید بھٹہ ، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ لاہور، اگست ۱۹۹۱ء
ملتان دیاں واراں ،شوکت مغل، سرائیکی ادبی بورڈ ملتان، مئی ۱۹۹۴ء (طبع دوم ۲۰۰۴ء)
وَین ، مہر مظفر علی حان، طاہر چنڑ ایڈووکیٹ جھنگ، ۱۹۹۷ء
ملوہیا سدا سہاگن ، شبیر حسن اختر، سرائیکی ریسرچ سنٹرBZUملتان، ۲۰۰۴ء

جبکہ ''نادر شاہ دی وار ''دو کتابوں میں موجود ہے۔

نادر شاہ دی وار ، نواب سیال ، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ لاہور، ستمبر۱۹۸۹ء
سرائیکی تاریخی واراں ، م ۔ی قیصرانی ، ریپبلکن بکس لاہور، مارچ ۱۹۹۴ء

سرائیکی زبان میں تاریخی واروں پر کام کرنے والا اہم نام م۔ ی قیصرانی کا ہے جن کی مرتبہ چار واریں ماہنامہ 'سرائیکی ادب 'میں شائع ہوئیں۔

۱۔ صوبے دی وار (اکتوبر۱۹۸۴ء)
۲۔ لائل پور دی وار (جولائی اگست ۱۹۸۸ء)
۳۔ رابرٹ سنڈیمن دی وار (مئی ۱۹۹۲ء)اور
۴۔ شملے دی وار (فروری ۱۹۹۶ء)

''صوبھے دی وار ''کو عمر کمال خان نے ''ملتانی واراں ''میں اور شوکت مغل نے ''ملتان دیاں واراں''میں شامل کیا ہے۔(۵)

م ۔ ی قیصرانی کا تحقیقی کام بالآخر ''سرائیکی تاریخی واراں ''کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوا تو ''سرائیکی ادب ''ہی میں دو فاضل نقادوں نے ان کے کام کی تعریف کی۔ اسماعیل احمدانی کا تبصرہ مئی ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا جبکہ ڈاکٹر اسلم عزیز درانی اپنے تبصرے میں لکھتے ہیں:

''اس (م ۔ ی قیصرانی) کے ادبی ذوق نرالے،منفرد، انوکھے اور مشکل ہیں۔یعنی تحقیق وتفتیش خصوصاً سرائیکی کی تہذیب اور ثقافت کا کھوج اور اس کی بازیافت''۔(۶)

اس بات کی تصدیق اس طرح بھی ہوتی ہے کہ خود م ۔ ی قیصرانی نے اپنی کتاب مطبوعہ مارچ ۱۹۹۴ء میں لکھا تھا کہ ''مشہور شملہ دی وار باوجود تلاش کے نہیں مل سکی''(:۷) مگر یہ ان کی جستجو ہی کا نتیجہ ہے کہ تقریباً دو سال بعد (سرائیکی ادب ،فروری ۱۹۹۶ء)وہ مکمل وار تلاش کرکے چھپوا چکے ہیں۔سرائیکی میں تاریخ واروں کے بعد دوسری بڑی قسم روحانی واروں

کی ہے۔ مذہبی ماحول میں لکھی گئی وار کو ہم روحانی وار کہہ سکتے ہ یں۔ ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے ایک قدیم پوڑی (جو گیارہویں بارہویں صدی کے درمیان لکھی گئی) کا ذکر کیا ہے جس کے آٹھ بندوں میں سے چار بندوں میں ملتان، اُوچ اور پاکپتن کے بزرگوں کے حوالے اور ان سے عقیدت کا اظہار کیاہے۔ اسی طرح نجم حسین سید (پیدائش ۲۷اکتوبر۱۹۲۷ء) کی ''ملتان شہر دی وار ''شائع ہوئی۔ یہ ایک طویل بیانیہ نظم ہے جس میں حضرت شاہ شمس ملتانی کو علامتی طور پر ان قدروں کے خلاف لڑتے ہوئے دکھایا گیا ہے جو سماج پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کیلئے حاکموں، سرمایہ داروں اور ان کے گماشتوں کی قائم کی ہوئی تھیں۔ م ۔ ی قیصر انی نے بھی اپنی کتاب میں (صفحہ ۴۳تا ۵۴)سمینہ کے بزرگ سید عبداللہ کی وار شامل کی ہے۔ سمینہ دی وار ''کی تفصیل میں بتایا جاتا ہے کہ مرانی جنہوں نے پندرھویں صدی عیسوی سے اٹھارہویں صدی عیسوی کے تقریباً۳۰۰سال تک ڈیرہ غازیخان پر حکومت کی ، ان کا ایک سردار سلیمان خان سمیسن تھا جسے نواب غازی خان نے موجودہ ڈیرہ غازیخان سے سات میل شرقی جنوب میں دریائے سندھ کے مغربی کنارے کا علاقہ جاگیر کے طور پر دیا (یوں یہ علاقہ سمیسن سے سمینہ بن گیا) کچھ عرصہ بعد سمیسن قبیلے کے پیر سید عبدالہ شاہ شامی اٹھارویں صدی عیسوی میں یہاں آکر آباد ہوئے ۔(یہ حافظ جمال اللہ ملتانیؒ ۱۸۰۸ء کے عم عصر تھے)۔ پیر عبداللہ شاہ کی صوفیانہ کرامات سے متعلق کیپٹن آر سی ٹمپل نے ''دی لیجنڈ آف دی پنجاب ''جلد دوم مطبوعہ ۱۸۸۵ء میں ایک قصہ بھی مسٹر لانگ ورتھ ڈیمز کے حوالے سے شامل کیا ہے جو اسے روجھان کے غلام محمد بالا چانی مزاری بلوچ نے سنایا تھا۔ یہ وار اسی قصے سے متعلق ہے ۔ وار کے واقعات۱۷۳۹ء ۔ ۱۷۶۹ء کے درمیان کے ہیں (یہ دور محمود خان گجر کا دور ہے جسے ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے ڈیرہ غازیخان میں اپنا نائب تسلیم کیا تھا اور جو عملاً ۱۷۶۹ء تک گورنر رہا)۔(۸)

ملتان کے حوالے سے اگر واریں لکھی گئی ہوں گی تو تین مہتمم بالشان کردار ضرور اس کا مرکزی کردار ہوں گے ایک پرہلاد جس پر آگ ٹھنڈی ہوگئی،دوسرے شاہ شمس سبزواری،تیسرے نواب مظفر خان(۱۷۵۷۔ ۱۸۱۸)جنہوں نے سکھوں سے لڑتے ہوئے اپنی بیٹی بخت بھری اور پانچ بیٹوں شاہ نواز،ممتاز،شہباز،اعزاز اور حق نواز کے ساتھ جان دی۔ان کے بارے میں بہت سے شاعروں نے واریں لکھی ہوں گی،ان میں ایک نظام کی وار ہے،دوسری سید ساجد علی فنائی کی جو عاقبت بخیر کے نام سے انجمن ترقی اردو اور بزم ثقافت ملتان سے شائع ہوئی،جس کا ایک حصہ دیکھئے:

تو دھمکی سے اے راجہ سِکھّاں کا لیا چاہتا ہے قلعہ ملتان
نہ جب تک کہ مردوں کی دھاڑیں پڑیں نہ جب تک کہ توپوں کی ماریں پڑیں
نہ جب تک کہ فوجوں کی ہو دھوم دھام نہ جب تک کہ خوں ریزی ہووے تمام
نہ جب تک کہ خون بیچ ڈوبیں اجسام نہ جب تک کہ منہ خون سے ہو سرخ نام

قلعہ کا تو ملنا یہ ممکن نہیں اُڑے تو اگرچہ بہ عرشِ بریں
سیانا ہو کر تو ایانا ہوا تو جا بیٹھ گھر میں دیوانا ہوا
کہ شیروں سے یا باگ سے لے شکار سنا نہیں بغیر از کئے کارزار
مرے جیتے ملنا قلعہ کا محال کوئی دیکھے اس کی طرف کیا مجال
لڑائی تو کرنا ہمارا ہے کام جہاں میں اسی سے ہمارا ہے نام
زمینداری کے کام تجھ پر تمام اور خوں ریزی کے کام مجھ پر تمام

مگر یہ اس خطے کے محققین کی نارسائی ہے کہ میر ساجد علی فنائی کی دیگر تصانیف اور ان کے سوانحی حالات کا سراغ نہیں لگا سکے حالانکہ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری کے مخطوطات کی فہرست میں ان کا ایک فارسی مخطوطہ شامل ہے،اس میں شک نہیں کہ تقسیم ہند اور ہولناک فسادات اور آتش زنی نے ملتان کے نجی کتاب خانوں کو بہت نقصان پہنچایا پھر بالکشن بترا،گوپی چند نارنگ اور ہیرا نند سوز یا فکر تونسوی جیسے پڑھے لکھوں کے ترک وطن نے اس خطے کے بارے میں ریسرچ کو نقصان پہنچایا اور قیام پاکستان کے بعد ایک ایسی فضا بنی کہ کسی زبان

اور زمین کے حوالے سے کسی نے کام کرنا چاہا تو اسے قومی مصلحتوں سے ہم آہنگ خیال نہیں کیا گیا۔گویاغیر مسلم تخلیق کار ایسے ہیں جنہیں بہ امرِ مجبوری یہاں سے جانا پڑا۔ ہجرت انسانی خمیر کا حصہ ہے۔ ہر مہاجر کے خواب عمر بھر اپنی آبائی سرزمینوں میں ہی بھٹکتے رہتے ہیں۔ کون سی زمین کس کی ہے۔ اس بات کا فیصلہ تو اسی وقت ہوجاتا ہے جب کوئی کسی جگہ جنم لیتا ہے ۔ کردار، کلچراور مٹی سے کشیدکی ہوئی دھرتی کا بھلا کیا مول ہوتا ہے۔ اپنی زبان، اپنی تاریخ، اپنی دھرتی ، اپن کلچر، اپنی ہوا، اپنا پانی تخلیقی عمل کیلئے بے حد ضروری ہے ۔

کرشن چندر اور بہت سے بڑے ادیبوں نے زبان کو زبان کو ماں کا درجہ دیتا ہوں۔ اس لئے زبان کا ہر لفظ چاہے وہ کسی زبان میں ہو وہ مقدس ہوتا ہے ۔ بہت کم کنبوں کو اتنا زیادہ قبیلے ہونے کا احساس ہوتا ہے ۔مائیگریشن اور اس کے نتیجے میں ایک خوبصورت کلچر کی پامالی ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نقل مکانی کے سبب سرائیکی زبان کا دوسرا بڑا مرکز ہندوستان ٹھہرا۔ جہاں ۱۹۴۷ء میں یہاں سے جانے والوں نے اپنی زبان وادب کی آبیاری کیلئے نامساعد حالات کے باوجود اپنی کوششوں کو تاحال ترک نہیں کی۔ چنانچہ تنویر شاہد زئی(مرتب کتاب) لکھتے ہیں:

> "۱۹۴۷ء میں "نظریہ پاکستان "کے نام پر اس دھرتی پر بھی ایک ایسا ہی بدلاؤ آیا تھا ۔ گو میں سچے دل سے اس نظریہ کا حامی ہوں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اسی سال یہ جنت بھی طوفانِ نوح کی لپیٹ میں آگئی تھی۔ ہمارے ہاں اب بھی کئی دیہاتی بزرگ اس سال کو "لوٹی آلا سال "کہتے ہیں۔ آج بھی جس وسیب میں زندگی کی بنیادی سہولتیں نا پید ہیں۔ ۶۷برس قبل اس دھرتی کا کوئی شہر قصبہ ایسا نہ تھا جہاں کوئی علمی نابغہ موجود نہ ہو۔ ان تخلیق کاروں کا اس خطے سے تعلق اس خطے کا علمی وتہذیبی مان ہے ۔" (۹)

ہمارا موقف ہے کہ مابعد نوآبادیات تنقیدی موقف میں اجتماعی خود شناسی کا ایک رومانی دعویٰ ضرور ہے مگر ابھی بھی وہ سب کچھ ہمارے محققین کا منتظر ہے جو فہارس مخطوطات اور حوالہ جاتی کتب،ماضی کے جرائد اور اخبارات کی فائلوں میں اور تو اور پنجاب آرکائیو لاہور(۱۰) اور کابینہ ڈویژن اسلام آباد میں انڈیا آفس لائبریری کے آرکائیوز کی صورت میں موجود ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ *مقدمات*، جھوک پبلشرز دولت گیٹ ملتان، ۲۰۰۸، ص:۵۶

۲۔ ایضاً ، ص:۸۲

۳۔ سجاد حیدر پرویز، *مختصر تاریخ زبان وادب سرائیکی* ،مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ص:۲۵

۴۔ سجاد حیدر پرویز ایضاًص:۲۶

۵۔ صوبھا یا سوبھا شجاع آبادی کا ذکر برطانوی عہد میں شائع ہونے والے گزیٹئر آف ملتان میں رومن سکرپٹ میں یہ وار ہے،افسوس کہ بعد میں کسی نے اس پر قابل ذکر کام نہ کیا۔

۶۔۷۔ بحوالہ سجاد حیدر پرویز ایضاً ص ۳۲۔۳۳

۸۔ ایضاً، ص:۲۷۵تا ۲۷۸

۹۔ تنویر شاہد محمد زئی،*مٹی ہجرت لکھتی ہے* ، سرائیکی ادبی بورڈ ملتان،۲۰۱۴ء،ص:۱۱تا ۱۳

۱۰۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ، *پنجاب آرکائیوز (آغاز و ارتقا)* از ڈاکٹر فضیلت بانو ایسکام پبلشرز اوکاڑا۔ ۲۰۱۷ء (۱۹۰ صفحات)